Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:8 (1967)

انتقاد

ISLAM ڈاکٹر فضل الرحمن، ڈائرکٹر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی راولپنڈی کی اس نام سے یہ تازہ ترین تصنیف لندن کی ایک فرم WEIDENFELD ANDNICOLSON نے چھاپی ہے۔ اس کے بڑے سائز کے ۲۶۵ صفحات ہیں۔ اور یہ ۱۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے عنوانات سے زیرِ نظر کتاب میں جن مسائل پر بحث کی گئی ہے، اُن کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

پہلے باب کا عنوان ہے: محمد (صلعم) ۔ ذیلی عنوانات ہیں:۔ محمد (صلعم) اور وحی ۔ آپ کی جدوجہد۔ آپ کی تدابیر ۔ یہودی اور عیسائی ۔

دوسرے باب کا موضوع قرآن ہے، اور اس میں ان امور پر بحث کی گئی ہے: قرآن کیا ہے؟ ۔ تعلیمات قرآن ۔ قرآن کی قانون سازی ۔ تفاسیر قرآن ۔

تیسرے باب میں حدیث، چوتھے میں فقہ اور پانچویں میں عقائدی بحثوں کے ضمن میں معتزلہ، اشعریت، ماتریدیت، فلسفہ اور کلام کا بیان ہے ۔ باقی ابواب کے عنوانات یہ ہیں:۔ شریعت ۔ فلسفی تحریک ۔ عقائد و اعمال تصوف ۔ صوفیہ کے سلسلے ۔ مسلمانوں کے فرقے ۔ نظامِ تعلیم ۔ جدید اصلاحی تحریکوں سے پہلے کی تحریکیں ۔ جدید اصلاحی تحریکیں ۔ ماضی کا ورثہ اور مستقبل کی توقعات ۔

شریعت کا تصور کن ارتقائی مراحل سے گزرا ۔ حدیث سے اس میں کیا اصلاح عمل میں آئی ۔ اس بارے میں امام ابنِ تیمیہ کا کیا تاریخی کردار ہے ۔ اس پر ایک باب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے ۔ تصوف پر دو باب ہیں ۔ جن میں تصوف کی ابتداء اور اس کے شروع کے مراحلِ ارتقاء ۔ متصوفانہ اداروں کا وجود

میں آنا، تصوف کے طرق، راسخ العقیدگی اور تصوف میں ملاپ اور تصوف کا بحیثیت مذہب عوام کے ہر لعزیز ہونا، ان امور کا ذکر ہے، ایک باب میں عصر حاضر میں یورپ کے اثرات کے آنے سے پہلے عالم اسلام میں جو اصلاحی تحریکیں اُٹھیں، اُن کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خود اسلام کے اندر سے اصلاح کی تحریکیں اُبھریں اور جب یورپ کے اثرات اسلامی دنیا میں پہنچے، تو وہ تحریکیں اسلامی ذہن کو ان اثرات کے بعض اجزاء کو قبول کرنے، بعض کو رد کرنے اور پھر ان نئے اور پرانے اثرات کو ملا کر ایک حد تک ایک ترکیب دینے کے قابل بنا چکی تھیں۔ کتاب کے دو باب ان تحریکوں پر ہیں۔

فاضل مصنف نے مقدمہ میں بتایا ہے کہ در اصل تو اس کتاب کی نوعیت معلوماتی ہے۔ لیکن چوں کہ اس میں اسلام کے ارتقاء کی مربوط کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس لئے یہ تعبیراتی بھی ہو گئی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:-

" مصنف کا یہ خیال ہے کہ ایک مذہب کو اور خاص کر جب وہ خود اُس مصنف کا اپنا عقیدہ ہو، محض " بیان کر دینا" اور قاری تک زندگی کی اُس باطنی حرارت کے کسی حصے کو جو عبارت ہوتی ہے عقیدہ سے، پہنچانے سے قاصر رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ یہ کتاب مغربی قارئین کے لئے بھی اسی طرح ہے، جیسے مسلمان قارئین کے لئے۔ ایک مسلمان کو اپنی مذہبی تاریخ زیادہ معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنا سکھنا چاہیئے، خاص طور سے یہ کہ خود اُس کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری۔ اور غیر مسلموں کو بھی ایک حد تک یہ "نا سیکھنا چاہیئے کہ اسلام ایک مسلمان کے باطن پر کیا اثرات ڈالتا ہے"

ہمارے ہاں اسلام کی مذہبی تاریخ کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا رجحان کب پیدا ہوگا؟ اس کے بارے میں تو کچھ کہنا مشکل ہے۔ لیکن غیر مسلم اور خاص کر ہمارے اکثر مستشرقین، اسلام کو اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ایک تحلیل و تجزیہ کا موضوع نہیں، بلکہ مسلمانوں کی باطنی زندگی کی وہ فعّال اخلاقی و روحانی قوت ہے، جسے کمیت کے بجائے کیفی معیار سے بھی جانچنا چاہیئے، یہ فی الحال ممکن نظر نہیں آتا۔

ابھی حال میں مشہور مستشرق شاخت نے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ایک کتاب — ISLAMIC ME-THODOLOGY IN HISTORY — پر تبصرہ کیا ہے، جس میں موصوف نے مصنف کو اس لئے جلی کٹی سنائی ہیں کہ اُنہوں نے "سنت" کا جو تصور پیش کیا ہے۔ اُس کا مقصد عملی ہے اور اسے قانون سازی کا اساس بنایا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں پروفیسر شاخت نے لکھا ہے:- "اسلامی فقہ اور اصول فقہ کے اصل مصادر کیا ہیں، اُن کی جو روایتی تصویر ہے، اس کا صحیح اور مستقل تبادل یقیناً صرف وہی ہے، جس کے عمومی

خط و خال مارگولیتھ نے پیش کئے، پروفیسر برنسیح دگ نے اسے تفصیل سے بیان کیا۔ اور جس پر میں گزشتہ پندرہ بیس برس سے کام کر رہا ہوں، پروفیسر شاخت کے نزدیک ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنے احادیث کو ماننے والے قارئین کے خیال سے اس حقیقی متبادل کو پیش کرنے کے بجائے الفاظ سے ایک فرضی سی تصویر بنا دی ہے۔

زیر نظر کتاب "ISLAM" میں بھی ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے حدیث و سنت پر بحث کی ہے، انہوں نے اس بارے میں گولڈزیہر، مارگولیتھ، لیمنز اور شاخت کی جو آراء ہیں، اور جس طرح وہ حدیث اور سنت کے وجود کا سرے سے انکار کرتے ہیں، اُن کا ذکر کیا ہے، اور پھر اُن پر تنقید کی ہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دعوے کہ احادیث کا بالجملہ وجود ہی بعد کی اختراع ہے۔ اور سنت اور حدیث کا رسول اللہ صلعم سے کوئی تاریخی تعلق نہیں، سراسر غلط ہے۔

کتاب کا آخری باب "ماضی کا ورثہ اور مستقبل کی توقعات" بڑا معلومات افزا اور فکر انگیز ہے پہلے تیرہ ابواب میں اسلام کے مذہبی ارتقاء کا ذکر کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس چودھویں باب میں اس امر کا جائزہ لیا ہے کہ مسلمانوں کو آج اس زمانے میں جو چیلنج در پیش ہیں۔ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اُن کے پاس اسلام کا کیا ورثہ ہے۔ اور وہ اس سے کس طرح استفادہ کر کے مستقبل میں گامزن ہو سکتے ہیں۔

مسلمانوں نے قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ "سلف" کو دین کا ایک حصہ بنا لیا۔ اور قرونِ اولیٰ کے بزرگوں سے منسوب روایات قرآن و سنت کی ایک قطعی و آخری تعبیر بن گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک مسلمانوں کے ہاں جو بھی اصلاحی تحریکیں اُٹھیں، انہیں بجائے آگے کی طرف بڑھنے کے پھر ماضی کی طرف لے جانے کی ذمہ داری زیادہ تر اسی تصور پر ہے۔ ہم نے "سلف" کو تاریخی حیثیت دی ہوتی، اور وہ دین کا جزو نہ بنا دیئے جاتے، تو امام ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب کی فکری انقلابی تحریکیں محض ماضی پرستی کی نذر ہو کر نہ رہ جاتیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ بہت سے اذعانی اور دینیاتی معتقدات جو اسلام میں نمو پذیر ہوئے، درحقیقت اُن کا منبع و مصدر سیاسی ہے۔ خارجیوں کا ہر ایسے مسلمان کو جس سے کوئی گناہ مرتکب ہو۔ کافر قرار دینا، اور "ان الحکم الا اللّٰہ" کے تحت ہر سیاسی اقتدار کے خلاف جہاد کرنا موجب بنا اس عقیدے کا کہ ہر کلمہ گو خواہ اس سے کتنے بھی گناہ سرزد ہوں، مسلمان ہے اور ہر فرمان روا کی خواہ وہ کتنا بھی گناہ گار ہو، اطاعت

ضروری ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اُس وقت اُمت کو مذہبی اور سیاسی انتشار سے بچانے کے لئے یہی واحد راستہ تھا۔ اسی طرح شیعوں کے امامت کے عقیدے کے جواب میں اہلِ سنت کو اجماع کا اصول نافذ کرنا پڑا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ اس طرح کے معتقدات جو ایک خاص زمانے اور مخصوص ماحول کی ضرورتوں کے تحت لازمی تھے، ابدی مان لئے گئے اور ان کا نتیجہ آگے چل کر بحیثیت مجموعی اُمت کے لئے اچھا نہ نکلا۔

ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں "سیاسیات کے میدان میں آج مسلمانوں کے سامنے یہ کام ہے کہ وُہ اپنی تاریخ کے بے لاگ تجزیے کے بعد اس مسئلے میں جو راسخ العقیدہ مواد ہے اس کو نئے سرے سے مرتب کریں اور ایسے موزوں ادارے وجود میں لائیں، جن سے ان امور کا تحفظ ہو سکے۔ (۱) اُمت اور ریاست کا اتحاد اور استحکام۔ (۲) حکومت اور ریاست کے معاملات میں وسیع پیمانے پر لوگوں کی فعال، مثبت اور ذمہ دارانہ شرکت۔ اگر ایک بار ان اصولوں کو پوری طرح از سرِ نو واضح کر دیا گیا تو اسلامی ریاست کی کوئی نہ کوئی پائدار شکل ظہور پذیر ہو جائے گی۔ اور بہت سی اس قسم کی موجودہ بحثیں، جو زیادہ تر سطحی اور متعصبانہ ہیں، کہ آیا اسلام ڈیموکریٹک ہے یا نہیں، خود اپنی موت مر جائیں گی۔ اب اگر لوگوں کو ریاست کے معاملات میں ذمہ داری سے حصہ لینا ہے، تو ضروری ہے کہ ریاست کی کوئی نہ کوئی جمہوری شکل ہو۔"

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں:۔

"لیکن اس کے لئے یہ لابُد ہے کہ مسلمان اس مسئلے کو خود اپنے باطن کی روشنی سے طے کریں۔ اور اس ضمن میں براہِ راست اور بلا واسطہ خارجی دباؤ سے (جو خارجی پروپیگنڈا کے ذریعہ ہوتا ہے) اپنے آپ کو آزاد رکھیں۔ ہاں وہ دوسری قوموں کے تجربات سے بے شک سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے ایسا کیا، تو وہ اسلامی اُصولوں کو اتنا وسیع پائیں گے کہ اُن میں مختلف نوع کے دستوروں کی گنجائش ہو سکتی ہے۔"

مسلمانوں کی تاریخ میں خوارج، معتزلہ، اشعریت، تصوف اور بعد میں امام غزالی، امام ابنِ تیمیہ، امام فخر الدین رازی اور محمد بن عبدالوہاب کی فکری تحریکوں نے جو مثبت اور منفی اثرات چھوڑے ہیں، اُن کا مختصراً جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر صاحب اسلامی فکر و عمل کی تشکیلِ نو کے امکانات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:۔

موجودہ صورتِ حال کا واحد حقیقی علاج یہ ہے کہ جدید تعلیمی نظام میں بنیادی اصلاح ہو، اور سکولوں اور کالجوں میں دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ حقیقی اسلامی قدروں کی تلقین کی جائے، صرف اسی طرح

موجودہ سیکولر تعلیم کو بامعنی طور پر ہمہ گیر و جامع اسلامی ثقافت میں سمویا جا سکتا ہے، اور وہ تخلیقی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ ورنہ یہ سیکولر تعلیم ایک خارجی چیز رہے گی، جسے زبردستی ایک نظام کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن بقول مصنف، یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے نام سے کیا پڑھایا جائے؟ جہاں تک علم الکلام کا روایتی اسلام ہے، اُسے آج کا ذہن سمجھنے سے قاصر ہے، اور اگر کوشش کر کے اُسے وہ سمجھ بھی لے، تو موجودہ حالات میں وہ زیادہ بامعنی بھی نہیں، غرض اسلام کو آج اس شکل میں پیش کرنا ہوگا کہ وہ جدید ذہن کے لئے قابلِ قبول بھی ہو، اور بامعنی بھی۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی یہ کتاب 'ISLAM' یوں اختتام پذیر ہوتی ہے:-

"اس اصلاحی کام کو سرانجام دینے کے سلسلے میں ایک اور بنیادی ضرورت کو پورا کرنا ہوگا اگر اسلام کی دینیات اور قانون کو صرف جدید انسان اور معاشرے کی ضروریات ہی پورا کرنا نہیں، بلکہ انہیں جدید انسان اور معاشرے کو انتہائی بھدی قسم کی سیکولرزم کے مذہب اور اخلاق کو نفی کرنے والے اثرات سے محفوظ کرنا ہے۔ اسی لئے اس تشکیلِ نو میں خاص طور سے اخلاقی اور مذہبی عواطف و جذبات کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے مناسب جگہ دینا اور انہیں منضم کرنا ہوگا۔ اسلام کی پہلے جو تشکیل ہوئی، اُس کے پرانے شرعی ضوابط میں چوں کہ اس عنصر کو اُس کا مناسب مقام نہیں دیا گیا تھا، اس لئے تصوف قریب قریب ایک جداگانہ مذہب بلکہ بہت حد تک علماء کے "سرکاری" اسلام کے متمقابل کے طور پر ارتقاء پذیر ہو گیا۔ بعض معاملات میں تصوف اپنے ارتقاء کے دوران صریحاً غلط راہوں پر پڑ گیا، تو بے شک اس کی وجہ مخصوص وسیع تر اور گہرے معاشرتی عوامل تھے، لیکن یہ کہ تصوف اصلاً اور بنیادی لحاظ سے بعض مخصوص اساسی مذہبی ضرورتوں کی پیداوار تھا، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کی اصلاحی تحریکوں اور خاص کر جدید عہد کی تحریکوں میں تصوف دشمنی کا ایک طرفہ رجحان ورثے میں پایا جاتا ہے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ تصوف کا باقاعدہ نظام مع اپنے مخصوص طریقوں کے لازماً غیر معاشرتی اور غیر اخلاقی رجحان پیدا کرتا ہے۔ اور اُس کا ایک جداگانہ قریب قریب مذہب کے طور پر وجود تسلیم کرنا اسلام اور جدید زندگی ہر دو کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی "دل" کی سچی اور حقیقی باطنی زندگی کو، جو تصوف کی بنیادی اُمنگ ہے، شریعت میں نئے سرے سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ اور اس سے اعراض آگے چل کر اور لازماً جدید سیکولرزم کے تباہ کن حملوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔"

"اسلام" اللہ کی مرضی کے سامنے سر جھکانا، یعنی دنیا کے طبعی ہست وبود میں اللہ کے حکم یا اخلاقی فریضے کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کرنا ہے، اسی کا نام "اللہ کی عبادت" ہے۔ یقیناً مسلمان اس عقیدے سے محروم نہیں ہوا کہ وہ "اللہ کی عبادت" کی یہ خدمت بجالا سکتا ہے اور اُسے یہ بجالانی چاہیئے، وہ اس وقت اپنے دل کو ٹٹول رہا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ اس خدمت کے کامل تر معنی جن کا ماضی میں اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا، ڈھونڈے۔ اور اُس کی بصیرت کا، جواب پیدا ہو رہی ہے، کیا درجہ ہے، اور وہ کس قدر وسعت پذیر، صحیح اندیش اور مؤثر ہے۔ یہ چیزیں شاید نہ صرف اُس کے مستقبل کو بلکہ اُس کی ارد گرد کی دنیا کو بھی بہت حد تک متاثر کریں۔

کتاب میں تصوف اور راسخ العقیدگی کے درمیان شروع میں کش مکش، پھر قرب اور بعد میں بہت حد تک ہم آہنگی کی جو فضا رہی، اُسے بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ تیسری صدی ہجری کے بعد تصوف کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اور اس کے بعد دور دراز ملکوں اور قوموں میں اسلام کی نشر و اشاعت زیادہ تر تصوف ہی کے ذریعہ ہوئی، اور وہ اس لئے کہ تصوف کا نقطۂ نظر مقامی خصوصیات و حالات کے معاملے میں بڑا وسیع القلبی کا تھا، اور نو مسلموں کو اس کے توسط سے اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے لئے بہت زیادہ ذہنی مسافت طے نہیں کرنی پڑتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے بتایا ہے کہ اس سے جہاں مسلمانوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا، وہاں اسلام کو یہ نقصان پہنچا کہ اُس کی خالص تعلیمات میں طرح طرح کے توہمات داخل ہو گئے۔ اور اُس کے اصل جوہر کی پہلے کی سی آب و تاب نہ رہی۔

مصنف کے نزدیک اُن اصلاحی تحریکوں کا جو دنیائے اسلام میں یورپی اثر کے تحت ابھرنے والی اصلاحی تحریکوں سے ماقبل اُٹھیں، محرک جذبہ اسلام کی صحیح روح کا تصوف کی اسی بگڑی ہوئی صورتِ حال کے خلاف ردِ عمل تھا۔ یہ دراصل کوشش تھی اسلام کی خود اپنے آپ کو پانے کی۔ اپنی صحیح، خالص، اور ابتدائی شکل میں۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اسلام کے نئے دَور کی ابتدا ان تحریکوں سے کرتے ہیں۔ (م-س)

طابع۔ ظہیر الدین　　　مطبع۔ استقلال پریس لاہور

ناشر:۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن۔ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، راولپنڈی۔